© rasailojaraid.com

انسانیت کی تعمیرِ نَو اور اسلام

(عبدالحمید)

(۲)

تہذیبِ الحاد کے ان سارے عناصر نے انسانیت کے اچھے احساسات، پاکیزہ جذبات اور اخلاقی اقدار کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے اُس سے کچھ بڑھ چڑھ کر کام معاشرتی ارتقاء کے نظریہ نے کیا ہے۔ مادیت پرستی کے بطن سے یہ نظریہ پیدا ہوا، افادی طرزِ فکر (Utilitarian point of view) نے اسے پروان چڑھایا اور زمان و مکان پر انسانیت کی فتح نے اسے شبابِ جاوداں بخشا۔ اس کی پرورش میں کانٹ (Kant)، فشٹے (Fischte)، ہیگل (Hegel)، مارکس (Marx) اور اسی طرز کے بیشمار اصحابِ فکر نے حصہ لیا۔ اس کے برومند ہونے کے ساتھ ہی ظلم نے انصاف کا، شیطنت نے شرافت کا روپ دھار لیا۔ پھر خونریزی، سفاکی، زبردست آزاری، انسانی اخلاق کے نوامیسِ عالیہ قرار پائے۔

یہ مختصر سا مقالہ کسی تفصیلی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ یہ نظریہ کن کن افکار سے عبارت ہے۔ اس ضمن میں ہم اپنی گفتگو کا آغاز ہیگل سے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اگرچہ یہ نظریہ دنیا میں صدیوں سے موجود ہے مگر جس مفکر نے فکر کی پوری گہرائی اور استدلال کی پوری قوت کے ساتھ اس کو ایک واضح اور مربوط و مبسوط شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ہیگل ہی تھا۔

فلسفۂ تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ ایک عجوبہ ہے کہ کانٹ کے نظامِ فکر کی جس زور سے جرمنی کا یہ ہونہار فلسفی تردید کرتا ہے اُس سے کہیں زیادہ محنت اور کاوش کے ساتھ وہ اس کی تائید بھی کرتا ہے

ل جن کا ذکر پچھلے شمارے میں کیا جا چکا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کے بے رنگ خانوں میں استدلال کے رنگ بھرتا ہے اور اس طرزِ خیال کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے[1] جس کو عقلیت کے "بُت شکن" نے شروع کیا تھا۔

فلسفے کی فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقا دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخِ انسانی کا ہر دَور ایک وحدت، ایک کُل ہے۔ اس دَور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے مثلاً معاشی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی، عقلی اور مذہبی تصورات ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ سارے ایک عصری وحدت کے رُخِ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ جب تاریخِ انسانی کا قافلہ "روحِ مطلق" کے اشارہ پر کچھ قدم آگے بڑھتا ہے تو خود اس کے اپنے کیمپوں میں سے کچھ حریفانہ افکار، رجحانات اور نظریات عَلمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں آجاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک زبردست لڑائی شروع ہوتی ہے مگر کچھ مدت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد ان میں آخر کار صلح ہو جاتی ہے اور دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر کو چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ وحدت ایک بالکل نئے نظامِ فکر و عمل کی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور انسانی تہذیب اس طرح ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔

اسی عملِ ارتقاء کو ہیگل اپنی مخصوص اصطلاح میں جدلی عمل (Dialetical process) کہتا ہے۔ اس کے نزدیک عرصۂ تاریخ یا میدانِ دہر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہو رہا ہے اور اسی کی قوت سے انسانیت ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ پہلے ایک دعویٰ Thesis سامنے آتا ہے۔ پھر اُس کے مقابلے میں جوابِ دعویٰ (Antithesis) پیش ہوتا ہے۔ پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد روحِ مطلق ان میں مصالحت کراتی ہے اور اس طرح ایک ایسی وحدت معرضِ وجود میں آتی ہے جو پچھلی وحدتوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے افضل و اکمل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ان

[1] Bertrand Russel: History of Western Philosophy

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب کے صالح اجزا شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسانیت جو قدم بھی اٹھاتی ہے وہ ہمیشہ آگے ہی پڑتا ہے۔

یہ ہے ہیگل کا نظریۂ ارتقاء

مارکس۔ نے اپنا فکری خاکہ ہیگل سے مستعار لیا مگر اس میں خود اپنے وجدان سے رنگ بھرے۔ اس نے روح کے تصور کو الگ کرتے ہوئے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقاء کی بنیاد قرار دیا۔ ہیگل کے نزدیک اگر مؤثر طاقت افکار کی ہے تو اس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کن قوت صرف مادی ماحول ہے اور اس میں بھی حقیقی اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے۔ ہیگل کے خیال کے مطابق اضداد کی جنگ تصورات کے ایوانوں میں لڑی جاتی ہے۔ مگر مارکس یہ سمجھتا ہے کہ زندگی کی اصل رزم گاہ معاشی میدان ہے اور اسی میں انسانیت کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز معیشت ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات اور اس کے تمدن اور اس کے علوم و فنون کی بالائی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ پیدائش دولت کے مختلف طریقے ہی کسی دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کی اس کے نزدیک یہ صورت ہے کہ پہلے معاشی پیداوار (Production) کے طریقوں میں ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسبابِ زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی ساری قدریں از خود بدل جاتی ہیں۔ اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب ان دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے اور بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزا شامل ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی طریق سے انسانیت کا ارتقاء ہو رہا ہے۔

تیسرا مفکر جس نے اپنے طرزِ فکر سے معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو ایک زبردست قوت فراہم کی وہ ڈارون ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور شکل و صورت میں تغیر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن انواعِ حیوانات کا ارتقاء قدرت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی تعمیری عمل کا رہینِ منت نہیں بلکہ تخریبی عمل کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ حیوانات کی باہمی جنگ، قحط اور موت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مالتھس کے نظریۂ آبادی پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لا کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ جانداروں کی تعداد خوراک اور قیامِ حیات کی دوسری احتیاجات کی نسبت بہت سرعت سے بڑھتی ہے، اس لیے ہر جاندار کو اپنے بقاء کے لیے دوسروں سے مسلسل جنگ کرنا پڑتی ہے۔

ڈارون کائنات کو ایک میدانِ کارزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے، جس میں ہر آن، ہر طرف زندگی اور بقاء کے لیے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر جسمانی طاقتوں کا مالک ہے وہی زندہ رہتا ہے۔ اور اصل میں وہی زندگی کی نعمت کا صحیح طور پر مستحق بھی ہے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ الغرض زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی صرف طاقتوروں کے وجود کو برداشت کرتے ہیں، کمزوروں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ اس کائنات کو اپنے "ناتواں" وجود سے جلد از جلد پاک کر دیں۔ اس طرح حالات کی مجبوری سے ارتقاء شروع ہوتا ہے اور ایک مسلسل کشمکش کے ذریعہ بلند تر حیوانات پیدا کرتا ہے۔ انسان بھی جد و جہد کی انہی پُر پیچ راہوں سے گزرتا ہوا انسانیت کی بلندی تک پہنچا ہے۔ جو کوئی بھی تنازع للبقاء کی بھٹی میں سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے وہ صالح ہے اور کائنات اپنی آغوش صرف اسی کے لیے کھولتی ہے۔

اب ان تینوں مفکرین کے افکار کو جمع کرنے سے معاشرتی ارتقاء کا جو نظریہ وجود میں آتا ہے اس کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

- ——— زندگی میں ارتقاء صرف کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے۔
- ——— اسی کشمکش کے نتیجے میں انسانیت ترقی کرتی ہے۔
- ——— اس کائنات میں جینے اور ترقی کرنے کا حق صرف اُسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت کا مظاہرہ کرے۔
- ——— یہاں اصل مقصد کامیابی ہے خواہ وہ کسی طریق سے حاصل ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر اس نظریہ کی فکری لغزشوں کی نشاندہی نہیں بلکہ ہمیں جو کچھ بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس طرزِ فکر نے انسانیت کی یہ بدخدمتی کی ہے کہ انسان کو انسان بنانے کی بجائے درندہ بنا دیا ہے اور دنیا کو جنت بنانے کی بجائے جہنم بنا ڈالا ہے۔

اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مادّی ترقی ہی انسانی زندگی کا معراج ٹھہری ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مادی ارتقاء شعورِ انسانی کی مدد کے بغیر ہے، اس میں از خود تخلیق کی صلاحیت نہیں نفسِ انسانی کی تخلیق کا اصلی محرک اندرونی روحانی جذبہ ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظریہ کے حامیوں نے ایک زبردست ٹھوکر کھائی۔ اب جبکہ انسانیت کے ارتقاء سے مراد صرف مادی ارتقاء ہے تو ضروری ہے کہ انسانیت کے مختلف گروہ اور طبقے مادی اسباب کی فراہمی کے لیے دیوانہ وار جد و جہد کریں اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہ ہوں کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خود موت کو دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرزِ خیال نے لوگوں کے اندر ایک مستقل خوفزدگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ فرد ہو یا قوم سب کے دل پر اسی خونخوار جذبے کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے اور سب لوگ ایک دوسرے سے لرزاں اور ترساں نظر آتے ہیں۔ اس مسلسل خوف نے انسانیت کے اندر نہایت ہی ذلیل خصائص کو اُبھارا ہے۔ مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، خیانت اور ریاکاری۔ عہدِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات نے اپنے انکشافات سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ انسان کے وہ اعمال جن کی غایت اپنی قوت کا اظہار ہے ان کے پیچھے خوف کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ فوجی قوت کی بے جا نمائش، خسروانہ جلال، اور غیر مسئول اقتدار کی ہوس سب اسی جذبے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرے اس طرزِ خیال نے انسانیت کے مستقبل کو سراسر تاریک کر دیا ہے۔ جو فلسفہ انسانی الغو ego، کے عملِ تخلیق کی توجیہ زمان و مکان کے ذریعے سے کرے وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ہے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو کبھی نجات نہیں دلا سکتا یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور اطالوی مفکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کروشے (Croce) اس کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے :-

" انسانیت پر کئی بار یاسیت کی پرچھائیں پڑی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی میں بے شمار اَدوار ایسے آئے ہیں جب انسان شک اور یاوسی کا شکار ہوا۔ مگر دورِ جدید میں یہ سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ فلاسفر یا وہ لوگ جن کی نگاہیں دور رس ہوتی ہیں وہ فلسفیانہ اور تاریخی حقائق کی بنا پر یہ پیشگوئی کر رہے ہیں کہ انسانیت کا قافلہ نہایت ہی خطرناک اور مہیب غاروں کی طرف جا رہا ہے۔ . . . . اس کا سبب یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس کائنات میں صرف ایسی قوتیں ہی کارفرما ہیں جو تمام تر خارج میں واقع ہیں۔ اور لگے بندھے قوانین کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ اِن قوتوں کے مقابلہ میں ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتے ہیں۔ ہمارے لیے امید کی اگر کوئی جھلک ہے تو صرف یہی کہ ہم خارجی دنیا میں ایسی قوتوں کا پتہ لگائیں جو یا تو بالکل مخالف سمت میں اپنا عمل جاری کریں، یا ان کو شکست دیں یا ان کی کارفرمائی کو کسی طرح روک دیں۔ مگر یہ خیال خام ہے کیونکہ اس میں بھی ہمارا سارا انحصار غیروں پر ہے[1] "

تیسرے چونکہ یہ نظریہ جس اساس پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت کا ارتقا باہمی کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے انسان میں تعاون کے احساسات اُبھرنے کی بجائے مخاصمت اور حسد کے جذبات بھڑکنے چاہئیں۔ یہ نظریہ انسانیت کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر تمہیں دنیا میں پھلنا پھولنا ہے تو تمہیں اپنا سب کچھ اس کشمکش میں جھونک دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان بالکل بے رحم اور سنگدل بن گیا ہے۔ اس کی رو سے اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ جینے کا حق صرف اُسی کو ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کمزور ظلم سہتا ہے اور قوت کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اس نظریہ نے نہ صرف انسانیت کو جابر

[1] Benedetto Croce: Politics and Morals

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ظالم بنا دیا ہے بلکہ ہر صاحبِ قوت کو برحق ثابت کر کے اس نے سرمایہ داری اور استعماریت کے لیے عقلی زمین فراہم کر دی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے شر سمجھ کر کیا جاتا تھا، اس فلسفہ نے اُسے سراسر خیر میں تبدیل کر دیا ہے پہلے لوگ ظلم کرنے والے کو ظالم سمجھتے تھے مگر اب اسے عادل تصور کیا جاتا ہے، ماکس ایسٹ مین (Max Eastman) نے جو بات تاریخ کی مادی تعبیر کے متعلق کہی ہے وہ درحقیقت معاشرتی ارتقا کے پورے فلسفہ پر صادق آتی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"اس نظریہ نے مارکسیوں کو اُن کے انسان دوستی کے سارے بلند بانگ دعووں کے باوجود متکبر اور متشدد بنالیا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ انسان ایک سخت اور شدید قسم کی کشمکش کے ذریعے ہی ترقی حاصل کرتا ہے۔ یہاں نیکی اور بدی دو مختلف قوتوں کے دو مختلف نام ہیں، جن کے مابین جنگ و جدال کے نتیجے میں انسان کو مقامِ محمود حاصل ہوتا ہے۔"[۱]

اسی طرح ایک فرانسیسی مصنف (Boris Sovrarine) نے بتایا ہے :-

"انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ آج کوئی ظالموں کی بہیمیت کو ختم کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، واقعہ یہ ہے کہ درندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔"[۲]

ایک اور مصنف کینتھ واکر (Kenneth Walker) اپنی کتاب "معنی اور مقصد" (Meaning and Purpose) میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"تریشکے (Trietschke) اور برن ہارڈی (Bernhardi) نے جنگ و جدال کی جو عظمت بیان کی ہے وہ ثمرہ ہے ڈارونیت کی المانوی توجیہ کا، انگلستان

۱؎ Benedetto Croce : Politics and Morals

۲؎ Max Eastman : Stalin's Russia

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، جو نپولین کے قول کے مطابق افواج سے نہیں بلکہ دکانداروں سے آباد ہے۔ انتخاب طبیعی کے تصور نے ایک بدترین معاشی رقابت اور مزدوروں کی طرف سے ایک مجرمانہ تغافل کے لیے وجہ جواز فراہم کی۔

پھر اس تصورِ حیات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کر دیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت اور کشمکش بشرطیکہ وہ مادّی اعتبار سے کامیاب ہو انسانی ارتقاء کی ضمانت ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کی بجائے قوت اور طاقت کی پرستش شروع کی۔ اس نے اپنی ذہانت اور طباعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا جس سے اُس کی قوت اور طاقت میں اضافہ ہو۔ جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ امپیریلزم اسی تصور کے شاخسانے ہیں۔ اس نظریہ نے تاریخ انسانی کے تاریک ترین ابواب کو روشن بنا دیا ہے۔ ہیگلی فلسفے کے ایک مشہور نقاد کروشے (Croce) نے بالکل سچ کہا ہے :۔

"اس طرزِ خیال میں قدامت پرستی، انقلاب انگیزی، اور بحالی (Restoration) الغرض سب کے لیے سندِ جواز موجود ہے۔[1]"

اسی طرح ایک دوسرے نقاد نے لکھا ہے :۔

"اس نظریہ نے مارکسی مصنفین کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنے آپ کو برحق ثابت کریں۔ یہی تصور موجودہ دَور میں ظلم و ستم کا سب سے بڑا سبب[2] ہے۔"

سب سے آخر میں اس طرزِ فکر نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کرنے کا درس دیا۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ اُن کا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے تقلد و استحکام، اور حصولِ قوت و اقتدار کے لیے کوشاں رہے، چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق کی پیروی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے مگر اس کے برعکس اگر کامیابی ان کو ترک کرنے سے

---

[1] Benedetto Croce: What is Living and what is Dead of the Philosophy of Hegel

[2] Max Eastman

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہوتی ہو تو انہیں فی الفور نظر انداز کر دینا چاہیے۔ پچھلی چار صدیوں میں "باطل پرست فلاسفر" اور "حکیم میکیاولی" کی تعلیم کو جو قبولِ عام نصیب ہوا اس کی بڑی وجہ یہی نظریہ ہے۔ ڈاکٹر فنک (Funk.) اور گوبلز (Goebbels) کے مندرجۂ ذیل الفاظ اس فکر کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہیں:۔

"ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے کو استعمال میں لا کر مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تحریک مذہب کے پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے۔ ہر وہ عمل جو استعماریت کے قلعے کو مسمار کرنے کے لیے کیا جائے وہ اخلاقی فعل ہے"۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اُن کے انسانی زندگی پر اثرات۔ دورِ حاضر کا انسان آج کل ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ علم و فن کی ترقی کے باوجود، مادی سروسامان کی فراوانی کے ہوتے ہوئے بھی دکھی ہے۔ زمین ہر سال اربوں ٹن غلہ اگلتی ہے، مگر اس کے باوجود اس کے ابنائے نوع بھوک کا شکار ہیں۔ علوم و فنون کے اَن گنت سرچشمے جاری ہیں، مگر انسان پھر بھی جاہل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جس جنت کے لیے تین چار صدیوں کا جانکاہ سفر طے کیا ہے وہ اسے اُس کی منزلِ مقصود سے بہت دُور لے گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ایک پیغام میں جو انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۵ء میں سالِ نو کے موقع پر دیا اس تہذیبِ الحاد کی ناکامی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت کے نہ جانے کون کون سے نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا"۔

اسی طرح انہوں نے موجودہ انسان کی بے کسی اور بے بسی کا جن واضح الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے، وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نہایت گہرے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

عشق ناپید خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

تہذیبِ الحاد کے عناصر کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم اُن اجتماعی تحریکات کا جائزہ لیں گے جو اس تہذیب کے سائے میں پروان چڑھی ہیں اور جن سے ہمیں اس وقت سابقہ درپیش ہے۔ یہ تحریکات اگرچہ ناموں کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر ان سب میں اسی مادر تہذیب کی روح جاری و ساری ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت

تہذیبِ الحاد کے افق پر جو تحریک سب سے پہلے نمودار ہوئی وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ آغاز میں اس کے متعلق لوگ بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرزِ حکومت کے معرضِ وجود میں آتے ہی انہیں اطمینان اور چین کا سانس نصیب ہو گا۔ مگر افسوس کہ توقعات کے یہ سارے خواب اور امیدوں کے یہ خیالی خاکے قلب و نگاہ کو پوری طرح نشاط و آسودگی بخشنے بھی نہ پائے تھے کہ اس کی تلخیوں کا احساس ہونے لگا۔ جب یہ خوابِ مجاز آشنائے تعبیر ہوا تو اس نے لوگوں کو سکون عطا کرنے کی بجائے اُن کا رہا سہا چین بھی لوٹ لیا۔ اس نئی تحریک کے سارے دعووں کے باوجود زندگی ہر آن تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے عوام کو قیصریت، پاپائیت اور جاگیرداری کے ظالمانہ تسلط سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی حد تک آزاد کیا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار کے خوف سے نہیں بلکہ افلاس کے دیو سے لوگوں کو اس طرح ڈرایا کہ لوگ خوفزدہ ہو کر از خود اپنے آپ کو "مالکانِ رزق" کی تحویل میں دینے کے لیے رضامند ہو گئے۔ یہ لوگ کمزوروں کی بے بسی سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے جس طرح کہ قرونِ وسطیٰ کے شہنشاہ اور جاگیردار۔ حقوقِ ربانی (Divine Right of Kingship) کے نظریہ کی جگہ بیشک معاہدۂ عمرانی (Social contract) کے نظریہ کو قبولِ عام نصیب ہوا مگر نظریات کی یہ تبدیلی حالات کو کسی صورت بھی بہتر نہ بنا سکی۔ آج بھی حکومتوں کی زمامِ کار عملاً چند مطلق العنان اشخاص کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ دولتمند انسانوں کا ایک مختصر گروہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ملک کے انسانوں کو بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اپنے قوت و اقتدار سے بے زبان گلے کی طرح میکانکی طور پر جدھر چاہے گھمائے۔ اس طبقے کی قوت و جبروت کے مدہش طلسم کو بے بس اور دکھی انسانیت آج غمزدہ اور اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہی ہے مگر اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتی۔

ہیرلڈ لاسکی (Harold Laski) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"حریت سے مراد آج آزادیٔ مطلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب قانون کے دائرے میں ایک محدود اختیار ہے، قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ناجائز انتفاع کرنے والوں کی ایک قلیل جماعت کے مفادات کی حفاظت کرے"

یہاں ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت سے بعض لوگ صرف ایک خاص قسم کی سیاسی ہیئت مراد لیتے ہیں۔ یہ ایک خام خیالی ہے جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت ایک مکمل فلسفۂ حیات اور ایک پورا نظامِ زندگی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ پروفیسر ڈیوی (Dewey) اپنی کتاب "اخلاقِ جمہوریت" (Ethics of Democracy) میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"یہ کہنا کہ جمہوریت صرف ایک خاص طرز کی حکومت ہے بالکل اسی طرح ہے اگر یہ کہا جائے

Harold Laski: The Rise of European Liberalism

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا گرجا ایک ایسی عمارت کا نام ہے جو کلس اور منبر پر مشتمل ہو۔"

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا صحیح طور پر تجزیہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ اس لیے ہم سب سے پہلے اس تحریک کے صرف سیاسی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس تحریک کا رفیع الشان قصر جس بنیاد پر اُٹھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مملکتی اقتدار کا اصل منبع مشیت عامہ (General Will) ہے جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے۔ یہ مشیتِ عامہ سیاہ و سفید کی مالک ہوتی ہے۔ وہ غیر اخلاقی افعال کو اخلاقی اور ناحق کو حق قرار دینے کی پورے طور پر مجاز ہے۔ اس نظریہ کی ترتیب میں ہابز (Hobbes)، لاک (Locke) اور روسو (Rousseau) ایسے بلند پایہ مفکرین نے حصہ لیا۔ یہ خیال کہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے اتنا پرانا ہے جتنی کہ مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ انسان شروع ہی سے اس بات کا متمنی رہا ہے کہ اُس پر اُس کے حسبِ منشا حکومت کی جائے۔ جو چیزیں اُسے مرغوب ہیں انہیں قانونی حیثیت دی جائے اور جو اس پر بار ہوں انہیں قانون کے دائرے سے نکال دیا جائے۔ مگر رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تصور وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا حتیٰ کہ اٹھارویں صدی میں یہ طے پایا کہ مملکت کے پیشِ نظر سب سے بڑا اور اہم مقصد "مفادِ عامہ" کی حفاظت ہے اور اقتدار کا اصل سرچشمہ حکومت نہیں بلکہ ملک کے عوام ہیں۔ ان مختلف اجزا کے مرکب سے مملکت کا جو نیا نظریہ تیار ہوا ہے وہ اپنے خصائص کے اعتبار سے سابقہ سارے نظریوں سے مختلف ہے۔ اس کی رُو سے محکوم کے سر پر حاکمیت کا تاج رکھا گیا ہے۔ پروفیسر ہیرن شا (Hearnshaw). جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"سیاسی نقطۂ نظر سے جمہوریت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی حاکمیت کے فرائض سرانجام دے۔"

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں ہم یُوں بیان کر سکتے ہیں کہ جمہوری نظامِ حکومت میں ملک کی آبادی خود اپنی رضامندی سے مملکت کو ایک ایسی قوتِ قاہرہ (Coarcive Power) فراہم

Dewey : Ethics of Democracy – P 15.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر کے دیتی ہے جس کی اطاعت ملک کے سارے عوام کرتے ہیں۔ گورنمنٹ جس کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہوتا ہے وہ عوام کی اجتماعی رضامندی کے تابع ہوتی ہے اور اس کا منصب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی خواہشات کو وضعِ قوانین اور تنفیذِ قوانین میں رُوبعمل لائے۔

اس نظریہ کی کمزوری کو اصحابِ فکر نے بالکل شروع میں ہی بھانپ لیا تھا۔ حتیٰ کہ رُوسیو Rousseau جو اس نظریہ کا سب سے بڑا مویّد تھا، اُس نے "معاہدہ عمرانی" (Social Contract) میں بتایا ہے کہ مملکت کے اس تصور کو چھوٹی ریاستوں[1] میں ہی عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے مگر جہاں مملکت کی حدود پھیلی ہوئی ہوں وہاں یہ طرزِ حکومت کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس نظریہ کی خامیاں خودبخود سطح پر اُبھر آئیں حتیٰ کہ اب جمہوریت کے سب سے بڑے حامی بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عوامی حاکمیت کا تصور محض ایک سراب ہے۔ اُلفرڈ کابن (Alfred Cobban) نے بالکل درست کہا ہے:-

"جمہوریت ایک خیالی محبوبہ ہے جو اگرچہ کنواری ہے مگر بانجھ بھی ہے[2]"

اس طرزِ حکومت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت از خود منکشف ہو جاتی ہے کہ جمہوری نظام اگر اپنے اندر افادیت کے کچھ جوہر رکھتا ہے تو وہ اُسی صورت میں نکھرتے ہیں جب عوام انتہائی ایماندار، بے لوث، اور بے غرض ہوں۔ جب وہ مفادِ عامہ کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ جن کی سیرت نہایت پختہ اور بصیرت نہایت گہری ہو۔ جو اتنے عقلمند اور ذہین ہوں کہ بھلے اور بُرے، حق و ناحق کے درمیان امتیاز کریں۔ اور سلطنت کے مفاد کو کسی قیمت پر بھی نقصان پہنچانے پر مائل نہ ہوں۔ اس کے ساتھ قوم کے مختلف عناصر ایک عضویہ (Organism) کی طرح مربوط ہونے کے علاوہ اپنی ایک مشیتِ عامہ بھی رکھتے ہوں۔ پروفیسر ریمزے میور (Ramsay Muir) کا قول ہے:-

"جمہوریت جس اساس پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ لوگ دیانت اور عدل کو سب سے عزیز رکھیں[3]"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے روسو کی کتاب Social Contract (Book III)

[2] Alfred Cobban : The Crisis of Civilizatian p. 75

[3] Muir : Peers and Bureacurats p. 154

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئیے اب ہم اس نظام کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کہاں کہاں خامیاں موجود ہیں۔ جدید مملکت کی سب سے اہم خصوصیت بلکہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کی کارفرمائی کو یکسر ختم کر دیا گیا ہے۔ جب تک لوگ اپنی شہری ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوں مملکت ان سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ وہ کسی نظامِ اخلاق کے پابند ہوں۔ مملکت کے اس تصور کو سب سے پہلے میکیاولی نے پیش کیا جس نے سیاست اور مذہب و اخلاق کو الگ الگ رکھنے کی تلقین کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر افراد اپنی زندگی کے معاملات میں کسی منصوص ضابطہ کے پابند نہ ہوں تو آخر اس کارزارِ حیات میں کون سے اخلاقی اصول اُن کی رہنمائی کریں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ذاتی نفع کا حصول یا بالفاظِ دیگر مادی نفع کی طلب ہی وہ اصل محرک ہے جو لوگوں کو سرگرمِ عمل کرتا ہے اور اُن کے اندر سعی و طلب کا ولولہ اُبھارتا ہے، اسی کی مقدار وہ اصل کسوٹی ہے جس پر انسانی افکار و اعمال کی پرکھ کی جاتی ہے۔ اب جبکہ مادی فوائد و لذائذ کا جمع کرنا زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد قرار پایا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ زندگی کی تحریصات اور ترغیبات سے متاثر ہوئے بغیر عدل و انصاف کے کٹھن راستہ پر گامزن رہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سارے لوگ اپنی زندگی کی کشتیاں رسل (Russel) کے الفاظ میں تملیکی تشاطر (Possessive hapiness) کے سمندر میں کھیتے ہوں وہ لازمی طور پر رقابت، خود غرضی اور بے جا تصرف کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی شادمانی محض بیرونی اشیا کی غلام ہوتی ہے اور جب ان چیزوں کے لیے چھین جھپٹ کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر لحاظ سے تباہ کن ہوتا ہے۔ جیتنے والوں کے ضمیر پر چیزوں کا تسلط رہتا ہے اور ہارنے والے اپنے نزدیک زندگی کا بہترین انعام کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قوم مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہے جن میں سے ہر گروہ با اختیار ہونے کا آرزومند ہوتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعے وہ دنیاوی فوائد زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکتا ہے۔ یہی وہ اصل کمزوری ہے جو موجودہ لادینی ریاست میں پائی جاتی ہے۔ نظری حیثیت سے تو جمہوری اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت کے حقوق حاصل ہیں اور کارپردازانِ حکومت ان سب کے ترجمان ہوتے ہیں مگر عملاً حکومت ایک طبقے کی خواہشات کے مطابق ہی کی جاتی ہے اور اس طرح مملکت کے باشندوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو حاکمیت سے یکسر محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے اور اپنے ہمنوا لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرے اور مخالفین کو جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچایا جائے۔ دورِ جدید میں اس کے اختیار کا دائرہ قرونِ وسطیٰ کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع ہے۔ ملک کے سارے معاشی ذرائع اسی مختصر سے طبقے کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عدالتیں، پریس اور مسلح افواج اسی کے اقتدار کی محافظ اور پاسبان ہوتی ہیں، نظامِ تعلیم اسی کی چاکری اور خدمت گذاری کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو ڈھالتا ہے۔ ان حالات میں اگر ملک کے مظلوم طبقے ظلم کے تسلط کے خلاف آواز بلند کر کے اپنے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی لانا چاہیں تو وہ سارے راستے مسدود پاتے ہیں۔ عدالتوں کے دروازے ان کے لیے بند ہیں، ملک کے قانون میں اس قسم کی کسی تبدیلی کے لیے گنجائش نہیں ہوتی، پریس اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اُن کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور اگر وہ دادرسی کے سارے آئینی راستوں کو بند پا کر غیر آئینی راستوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیے جائیں تو یہ نام نہاد جمہوریت بدترین ملوکیت سے زیادہ سفاک بن جاتی ہے۔ جس نظام میں قوتِ اقتدار کا اصل مدار ذرائع پیداوار کے قبضے پر ہو وہاں سماج کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ اس میں جو گروہ طاقتور ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے دوسروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے۔ جمہوریت کے ایک بہت بڑے نقاد نے اس نظام کا ذکر کرتے ہوئے بالکل درست کہا ہے:۔

"یہ (جمہوریت) ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ امرا کے لیے تو واقعی یہ ایک جنت ہے مگر کمزوروں اور ناداروں کے لیے یہ غلامی کا جال ہے۔"

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ اقتدار کی باگیں عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں دے دی جائیں مگر یہ عوام جن کو اتنا بڑا اور اہم کام سپرد ہوتا ہے اُن کا حال یہ ہے کہ غربت اُن کے اندر غور و فکر کی ساری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اُن میں اتنی بصیرت نہیں رہتی کہ وہ اپنے نفع و نقصان کا صحیح طور پر فیصلہ کر سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جانوروں کی طرح اپنے الگ الگ گروہ بنا لیتے ہیں اور پھر بغیر سوچے سمجھے اپنے اپنے دھڑے کے با اختیار لوگوں کی حمایت کرنا اپنی زندگی کا کمال سمجھتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی بلکہ اُن کی آواز اُن کے گروہ کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔

پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harold Laski) اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" (Crisis of Democracy) میں لکھتا ہے:-

"رائے عامہ کا سرچشمہ نہ تو علم ہے اور نہ عقل و فہم، بلکہ اسے ہمیشہ اپنے اپنے گروہ کے مفادات جنم دیتے ہیں۔ اسی لیے انتخابات میں فیصلے ایسے عجیب و غریب وجوہ کی بنا پر کیے جاتے ہیں جن کا کسی طرح بھی علمی تجزیہ (Scientific Analysis) نہیں کیا جا سکتا۔"

اگر ہم مختلف ممالک کے انتخابات (elections) کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ لوگ بالعموم کسی کو اپنے آگے لگاتے وقت اُس کے اخلاقی اور ذہنی اوصاف نہیں دیکھتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے، اور زبان کے استعمال میں کس قدر مطلق العنان ہے۔ وہ اُنہی لوگوں پر فریفتہ ہوتے ہیں جو اُن کا مُنہ حقائق سے موڑ کر انہیں آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے لے چلے۔ وہ عقل کی بات بتانے والوں کو اپنا دشمن اور خوش کن باتیں بنانے والوں کو اپنا مشفق سمجھتے ہیں۔ وہ اُسی شخص کے قدر دان ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ "خوشنما ہوائی قلعے" اُن کے سامنے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کے انتخاب میں پیہم غلطیاں کرتے ہیں مگر نصیحت نہیں پکڑتے۔ وہ اندھی پیروی کے اتنے خوگر ہو جاتے ہیں کہ کوئی خوفناک سے خوفناک سیاسی حادثہ بھی اُن کی آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ پھر ان چالاک اور عیار موقع بازوں (Opportunists) کو منتخب کر لینے کے بعد وہ یہ نہیں سوچتے کہ انہیں ان کے رہبر کدھر لے جا رہے ہیں۔ کارلائل (Carlyle) کے ذہن میں غالباً جمہوریت کی یہی کمزوری تھی جب اُس نے کہا:

"جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں اعلیٰ اور نیک خصلت مگر خاموش انسانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں اقتدار لاف زنوں اور جھوٹوں کے حصے میں آتا ہے۔"

بلیکی (Blackie) نے متعدد مثالوں سے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ عوام بالعموم یا تو فتنہ انگیز خطیبوں کے بھرّے میں آجاتے ہیں یا کسی خوشامدی کی چکنی چپڑی باتیں انہیں موہ لیتی ہیں۔ یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی راہنماؤں کی ظاہری شان و شوکت اُن کی نظروں کو مفتوح کر لیتی ہے۔ پھر یہ لوگ اپنے اندر اتنی اہلیت اور قوت نہیں پاتے کہ وہ اپنے میں سے کسی بہتر آدمی کا انتخاب کریں۔ اس لیے وہ ملک کی عنانِ اقتدار نااہل لوگوں کو سونپ دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں حکومت کی انتظامی مشینری اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ ایک عام انسان اُسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ صنعتی اداروں کے قوانین، بنک کاری (Banking) کے اصول، اور ٹکسالیک (Mintage) کے مختلف طریقے اتنے مشکل مسائل ہیں کہ ہر کس و ناکس اُن کو جاننے سے قاصر ہے۔ ان کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جو ان شعبوں میں خاص طور پر مہارت رکھتے ہوں۔ یہ مہارت اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے اور وسیع تجربہ کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ مگر دورِ جدید میں تعلیمی مصارف اس قدر زیادہ ہیں کہ دولتمندوں کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غریب تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کی زندگی کا راز بھی لوگوں کی جہالت میں پنہاں ہے۔ اگر درماندہ طبقوں کے ذہنوں میں فکر و احساس کی لہریں پیدا ہو جائیں تو وہ امیروں کے لیے خطرہ کا الارم ہے۔ اس لیے حکمراں طبقوں کی ساری کوششیں اس بات پر مرکوز رہتی ہیں کہ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جاہل رکھیں یا اُنہیں ایسی تعلیم دیں جو اُن کے اندر غور و فکر کی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی بجائے اُن کے ذہنی قویٰ کو یکسر معطل کر دیں۔ ہیرلڈ لاسکی لکھتا ہے:۔

"اگر علم کی کلید غربا کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ اس بات کو سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے جو بغیر کسی منصفانہ اصول کے سماج میں عدم مساوات کو روا رکھتا ہے۔ اس لیے تمام وہ حکومتیں جو عدم مساوات (inequality) کی اساس پر قائم ہیں، وہ اپنی قوت لوگوں کی جہالت سے حاصل کرتی ہیں۔ اور اس لیے ملک میں ایسا نظامِ تعلیم رائج کرتی ہیں جو اس غلط اساس کو کم سے کم صدمہ پہنچائے۔ لہٰذا تعلیم کا مقصد لوگوں کو علم سے بہرہ ور کرنا نہیں بلکہ سرمایہ داری کو ہر قسم کے حملوں سے محفوظ کرنا ہے[1]"

---

[1] Harold Laski : Crisis of Democracy p. 73

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قریب قریب یہی حال پریس کی آزادی کا ہے ۔ جمہوریت کے حامیوں کو پریس کی آزادی پر بڑا ناز ہے مگر اس سے بڑا فریب اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اخبار کا اجرا اور اس کا چلانا ایک زرِ کثیر کے بغیر ممکن نہیں ۔ اس لیے اس "کاروبار" کو صرف امیر لوگ ہی جاری کر سکتے ہیں ۔ ان کے پیشِ نظر اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں اور اپنے مستقل مفادات (vested interests) کی پاسبانی کریں ۔ اس کام کے لیے ہر ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پریس عوام کی راہنمائی کرنے کی بجائے ایک جھوٹ اگلنے والا چشمہ بن جاتا ہے ۔ خبروں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس سے ایک طبقے کے گنے چنے افراد کو فائدہ پہنچے ۔ اس طریق سے قوم کی قوم کو چند افراد حالات کا ایک خاص رنگ کی عینک سے مطالعہ کراتے ہیں ، اس کو ایک خاص زاویۂ نظر دیتے ہیں اور اس طرح آزادیٔ فکر بالکل ختم ہو جاتی ہے ۔ پریس حقائق کو نمایاں کرنے کی بجائے انہیں اس طرح پیش کرتا ہے کہ حقیقت جھوٹ کی بیشمار تہوں کے نیچے دب کر آنکھوں سے یکسر اوجھل ہو جاتی ہے ۔ خاص طور پر انتخابات کے زمانے میں پریس ذہنی فضا کو اتنا متلاطم کر دیتا ہے کہ انسان کے لیے سکون و اطمینان کے ساتھ حالات کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہو جاتا ہے ۔ ان حالات میں لوگ ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتے ہیں اور جب اُن کے فکر کے جہاز بے لنگر ہو جاتے ہیں تو پروپیگنڈا کی تند و تیز ہوائیں اُن کو جدھر چاہتی ہیں دھکیل دیتی ہیں ۔

اس کے ساتھ ملک کا حکمراں طبقہ پریس کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے بعض پابندیاں براہِ راست اُن پر عائد کرتا ہے ۔ خبروں پر سنسر (Censor) کے پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں تاکہ "درونِ خانہ" جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اُس کی کسی کو خبر نہ ہو ۔ پریس ایکٹ ایسے مذموم قوانین کو حرکت میں لا کر بوقتِ ضرورت نہایت آسانی سے مخالف آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ "اخلاقی" اور "قومی" اور "ملّی مفاد" کا بہانہ لے کر جب جی چاہے کسی مخالف آواز کو بڑی آسانی سے دبایا جا سکتا ہے ۔ یہ ہے پریس کی آزادی کی اصل حقیقت ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمہوریت کا جوہر آزادیٔ انتخاب اور آزادیٔ رائے دہی کا متقاضی ہے اور اس نظام کے علمبردار اس کے بڑے گُن گاتے ہیں، اسے انسانیت کا معراج اور عوام کی فتح خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے شاید ہی کوئی جھوٹ اتنا بڑا ہو۔ ملک کے سرمایہ دار ہزار قسم کی چالوں کو استعمال میں لاکر لوگوں کو حکومت کے انتظام و انصرام میں حصہ لینے سے روک دیتے ہیں۔ رائے دہی پر بےشمار ایسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں جن سے کسی مخالف کا منتخب ہوجانا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکہ ایسے قبلۂ جمہوریت کا یہ حال ہے کہ وہاں کے سیاہ فام باشندوں کو کاغذ پر ویسا ہی حقِ رائے دہی حاصل ہے جیسا کہ سفید فام لوگوں کو، مگر عمل کی دنیا میں حبشی اس حق سے بالکل محروم ہیں۔ اس بات کا فیصلہ صرف اس ایک چیز سے ہوسکتا ہے کہ پچھلے پچاس سال کے عرصے میں صرف ایک حبشی کانگرس کا ممبر ہوسکا۔ انتخاب کے وقت ان سیاہ فام لوگوں کو رائے دہی کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے بڑی بڑی آزمایشوں سے گزرنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے ہی ایک بھاری اکثریت اس حق سے محروم ہو جاتی ہے۔

ایک کتاب جس کا نام ہے "جمہوریت کا گھر سے آغاز ہوتا ہے" (Democracy begins at Home) اس میں اس کے مصنف جیننگ پیری (Jenning Perry) نے آزادانہ انتخاب کے دعوے کو ناقابلِ تردید دلائل سے باطل ثابت کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کس طرح ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۸ء تک ایک ٹیکس برابر اس مقصد کے لیے لگایا جاتا رہا تاکہ لوگوں کو ووٹ دینے سے روک دیا جائے۔ اس کا جو اثر ہوا وہ جمہوری نظام کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست ٹینس سی (Tennesee) کے گورنر کا جب انتخاب ہوا تو بارہ لاکھ ووٹروں میں سے صرف تین لاکھ باون ہزار ووٹ دے سکے۔

پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ووٹوں کے باقاعدہ سودے ہوتے ہیں اور انتخاب کی منڈی کے بعض "ہول سیل ڈیلر" بہت بڑے پیمانے پر یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ریاست ٹینس سی کے جس انتخاب کا اوپر ذکر کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گیا ہے اس میں ایک شخص ایڈورڈ ٹیل کرمپ کے متعلق یونائٹڈ پریس کے نمایندے کا بیان یہ ہے کہ تنہا اُس شخص کے قبضے میں ساٹھ ستر ہزار ووٹ تھے اور اس طرح ریاست کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں اس کی ذات کو بہت بڑا دخل تھا۔ یہ شخص ٹیلیفون پر بیٹھا ووٹوں کے سودے کیا کرتا[1]۔

اسی طرح ایک دوسرا مصنف ریمزے میوئر (Ramsay Muir) اپنی کتاب "انگلستان کی حکومت کس طرح چلائی جاتی ہے" (How England is Governed) میں برطانوی نظامِ انتخاب کو انتہائی غیر منصفانہ، غیر اطمینان بخش اور خطرناک سمجھتا ہے۔ اُس کا تجزیہ وہ یوں کرتا ہے:-

"اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے کہ کتنے ووٹ اس لیے ڈالے نہیں جاتے کہ بہت سے ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار موجود نہیں ہوتا، کتنے ووٹ ایک معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے "بڑی بلا" کے مقابلے میں "چھوٹی بلا" کے اصول پر نااہل لوگوں کو دے دیئے جاتے ہیں اور کتنے ووٹ ناکام امیدواروں کو دیے جانے کی وجہ سے بلحاظ نتیجہ ضائع ہو جاتے ہیں تو معلوم ہو گا کہ ملک کا سارا نظام صرف ملک کی ایک تہائی سے کم آبادی پر چلتا ہے۔"

اس پر مستزاد یہ کہ ووٹروں کو رشوت دینے کا رواج ملک میں صحیح رائے عامہ کو اُبھرنے نہیں دیتا۔ لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ووٹوں کی مدد سے ہی اقتدار کے بھوکے حکومت کے ایوانوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں بہرحال اُن کو خریدنا ہے۔ ووٹر اپنے ووٹ یا دوسرے الفاظ میں اپنے ضمیر کی آواز کا زیادہ سے زیادہ قیمت پر سودا کرتے ہیں۔ دوسری طرف ووٹ لینے والے بھی اس کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے ہیں، انہیں علم ہے کہ یہی وہ "سم سم" ہے جس سے اس راہ کی ساری منزلیں آسانی سے طے ہو جاتی ہیں اور کامرانی اور فیروز مندی کے "طلسمی دروازے" خود بخود کھل جاتے ہیں لہٰذا وہ اس گوہرِ نایاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس راز کا پتہ ہوتا ہے کہ

[1] یہ واقعات جناب نعیم صدیقی صاحب کی ایک تقریر سے جو انہوں نے ایک کتاب Soviet Democracy and Bourgeois Democracy سے اخذ کیے ہیں، لیے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس "کاروبار" پر لگا ہُوا سرمایہ چند دنوں میں ہی کئی گنا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ہر قسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود ووٹوں کی نیلامی ہوتی ہے۔ چنانچہ "امریکہ راز میں" (U. S. A. Confidential) کے مصنفین جیک لیٹ (Jack Lait) اور لی مارٹی مر (Lee Mortimer) نے اس حقیقت کا نہایت ہی جرأت مندی سے اعتراف کیا ہے:

"امریکہ کے عیار سیاستدان سیاہ فام لوگوں کے ووٹ خفیہ پولیس کے دباؤ سے، متراشے موت کے قانون کی تنسیخ کے لالچ سے، اور اسی قسم کے دیگر آئینی اقدام کے فریب سے ہتھیا لیتے ہیں۔"

ووٹ صرف زر اور عہدوں کے لالچ سے ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی ایک مکروہ طریقوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی اخلاقی اصول کی پابندی نہیں کی جاتی۔ اگر ضرورت پیش آجائے تو اقتدار کے سودے حسن کی قیمت پر بھی نہایت بے تکلفی سے چکائے جا سکتے ہیں۔

ان حقائق پر غور کرنے سے ہر صاحب فکر اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب اچھے اور قابل آدمیوں کو برسرِ اقتدار لانے میں سخت ناکام ثابت ہوا ہے۔ دورِ جدید کے انتخابات جاہ و حشمت کے پرستاروں کے لیے ایک میدان ہے جس میں وہ اپنی چالاکیوں اور عیاریوں کے پورے کرتب دکھا سکتے ہیں۔ جیک لیٹ (Jack Lait) لکھتا ہے:۔

"تاریخ نے بارہا اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اقتدار کے بھوکے افراد نہایت ہی خوفناک درندے ثابت ہوئے ہیں۔ اقتدار ایک قسم کا ڈائنامائٹ (Dynamite) ہے جو ان کے ہاتھ آجاتا ہے اور

۱؎ antilynch بل کے لیے اردو میں کوئی موزوں لفظ نہ ملنے کی وجہ سے اس کے مفہوم کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ امریکہ میں لنش کرنا Lynching انصاف کا ایک نرالا طریقہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلے پر مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سُست رفتار شیری کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دے دیں۔ اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سے وہ لوگوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔[1]"

لوگوں کی بدنصیبی انتخابات کے ختم ہو جانے کے بعد ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے اختتام پر ظلم و ستم کا آغاز ہوتا ہے۔ قوت حاصل ہو جانے کے بعد اقتدار کے بھکاری اُن سب وعدوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے دام میں پھنسا کر انہوں نے لوگوں سے ووٹ حاصل کیے تھے۔ جو لوگ ان کے اقتدار کی رکشا کو کھینچ کر حکومت کے ایوانوں تک لے جاتے ہیں اُنہی پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ اُن کی جیبیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے تراشی جاتی ہیں تاکہ ان کی تجوریاں بھریں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ آزادیٔ انتخاب ایک زبردست دھوکہ ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہو گا۔ یہ آزادی صرف اُن چند خوش نصیبوں کے لیے ہے جن کے پاس دولت ہے۔ یہ اتنے زبردست شواہد ہیں کہ کوئی صاحب بصیرت اور صاحب ضمیر ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ برطانیہ کے ایک مشہور وزیر سر سٹیفورڈ کرپس نے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا :-

"انتخاب کے مروجہ طریقوں میں بے شمار نقائص ہیں اور یہ نقائص نتیجہ ہیں اُس برتری کا جو کہ اصحاب ثروت کو غربا کے مقابلے میں نصیب ہوتی ہے"

تہذیبِ الحاد کی یہ "دخترِ نیک اختر" اپنے مزاج کے اعتبار سے اتنی ضدی اور عمل کے لحاظ سے اس قدر سست واقع ہوئی ہے "کہ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک"۔ اس کے جان نثاروں میں اوّل تو کوئی نیک اور شریف انسان اگلی صفوں میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر وہ بیچارہ کسی طرح آ بھی جائے تو وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے تئیں خارجی قوتوں کا بازیچہ تصور کرتا ہے۔ زمانے کی آندھیاں اُسے کبھی ایک طرف اڑا لے جاتی ہیں اور کبھی دوسری طرف۔ اُسے اتنی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اخلاقی معیار اور اپنے فکر و نظر کے ایقان سے حالات اور واقعات کو جانچ سکے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی رائے کا پابند ہوتا ہے۔ سیاست کے اس پورے ناٹک میں اُس کی ساری دلچسپیاں صرف اسی قدر ہیں کہ اُس کی اپنی ذات کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ جب حالات یہ ہوں تو کسی جرأت مندانہ اور موثر

[1] U. S. A. Confidential

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدم کا اٹھانا محال ہے۔ اگر چند سر پھرے اس طرف متوجہ بھی ہوں تو سوائے ناکامی کے انہیں کچھ نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جن میں نہ تو کوئی باطنی ہم آہنگی ہو اور نہ اشتراکِ احساس، اُن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عمل کے تنوع میں کوئی متحد کرنے والا حقیقت کا نقطہ پا لیں گے۔ اور جب تک اس نقطے کو تلاش نہیں کر لیا جاتا کسی اساسی تبدیلی کا لے آنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

بنیادی تبدیلیوں کا تو ذکر ہی کیا کسی قانون میں معمولی ترمیم بھی بڑا صبر آزما کام ہے۔ اس راستہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ متصادم طاقتوں کی منظم مخالفت کے علی الرغم رائے عامہ کو اُس کے لیے تیار کیا جائے پھر لوگ اس کے لیے ایک مسلسل اور پیہم جدوجہد کریں تب کہیں ممکن ہے کہ یہ مطالبہ "خداوندانِ مملکت" سے شرفِ قبولیت حاصل کرے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس میں اُن کے مفادات کو کوئی آنچ نہ آئے۔ اگر بالفرض رائے عامہ کے شدید دباؤ کے تحت یہ لوگ اس کو ماننے پر مجبور بھی ہو جائیں، تو پھر اس میں اس قدر تصرف کر لیا جاتا ہے کہ ترمیم بالکل بے سود ہو جاتی ہے۔ جمہوری ممالک کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم یہاں انگلستان کے صرف ایک قانون کی تنسیخ کا تذکرہ ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کسی ضروری ترمیم کو پاس کرا لینا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے۔

"اہلِ انگلستان نے نپولین کے ساتھ جنگ کے خاتمے پر غلّے کی درآمد بند کر دی۔ اس کا مقصد زمینداروں اور جاگیرداروں کو فائدہ پہنچانا تھا، مگر اس کے ساتھ ہی غریبوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ اس ہوشرُبا گرانی کی تاب نہ لا کر مجبور ہو گئے کہ اس قسم کے ظالمانہ اور غیر دانشمندانہ قانون کی تنسیخ کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو حکومت کے سامنے پیش کیا۔ مگر چونکہ ملک میں غلبہ و اقتدار کا مقام جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو حاصل تھا اور پارلیمنٹ پر بھی وہی چھائے ہوئے تھے، اس لیے عوام کی چیخ پکار کے باوجود حکومت کی بارگاہ میں اُن کی کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس ان "شر پسندوں" کو دبانے کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے۔ اس تحریک کے سربراہ کاروں پر مقدمے چلائے گئے۔ ہیبیس کارپس ایکٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Habeas Corpus Act) معطل کر دیا گیا۔ اس سے حکومت کے کارندوں کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ جتنی مدت چاہیں کسی کو قید و بند میں رکھیں۔ اس کے علاوہ چھ اور قوانین پاس کیے گئے جن کی رُو سے پمفلٹوں پر ایک بھاری ڈیوٹی عائد کی گئی اور یہ طے پایا کہ کوئی جلسہ بغیر صدر بلدیہ کی اجازت کے منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ مظلوم عوام کئی سال تک ان قوانین کو بدلنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پیل (Peel) جو اس وقت وزیر اعظم تھا وہ بھی باوجود پوری سعی کے اس میں ناکام ہوا۔ کیونکہ وہ مفاد پرست اکثریت کی حمایت نہ حاصل کر سکا۔ بالآخر مدت دراز کی جدوجہد کے بعد یہ قوانین منسوخ کیے گئے۔"[1]

اسی طرح ایک ایک فیکٹری ایکٹ (Factory Act) پاس کروانے کے لیے مزدوروں کو بیشمار قربانیاں دینی پڑیں۔ دُور کیوں جائیے اپنے ملک میں ہی ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں کے لیے کتنی چیخ پکار کرنا پڑتی ہے اور اس کے باوجود کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ایک اور دعوٰے یہ ہے کہ اس میں فرد کو آزادی حاصل ہے مگر یہ دعویٰ بھی اتنا ہی باطل ہے جتنے کہ دوسرے دعوے۔ آزادیٔ رائے اسی وقت تک قابل برداشت ہے جب تک کہ یہ حکمران طبقے کے مفاد کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو، مگر جونہی یہ اس پر اثر انداز ہونا شروع ہوتی ہے اُسی وقت اس کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ امریکہ جو جمہوریت کا سب سے بڑا دعویدار ہے وہاں ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا مقصد امریکہ دشمن عناصر (Un-American element) سے ملک کو پاک کرنا تھا۔ نیو یارک ٹائمز نے اس کمیٹی کی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سول سروس کمیشن کی جگہ اب ایک وفاقی محکمۂ تفتیش (Federal Bureau of investigation) قائم کیا گیا ہے۔ یہ اقدام نہایت ہی خطرناک ہے۔ اس سے دنیا سمجھنے لگے گی کہ متحدہ امریکہ (United States) پولیس اسٹیٹ میں تبدیل ہو جائیگی اس لیے یہ کاروائی بالکل تخریبی ہے۔"

---

[1] Warner and Martin : The Ground work of British History

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح ۱۹۴۷ء میں صدر ٹرومین نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس پر بغیر کسی ادنیٰ تامل کے عملدرآمد شروع ہوگیا۔ اس کی رُو سے تمام ملازمین کی تفتیش کی گئی اور تمام تخریب پسند عناصر کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیا گیا۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تمام وہ اشخاص جو اس آزمایش سے گزرے اُن کی مجموعی تعداد ۲۳۰۰۰۰۰ تھی۔ جس شخص کے متعلق "وطن دشمنی"[1] کا معمولی شبہ بھی ہوا اُسے نہ صرف یہ کہ وسائل رزق سے محروم کر دیا گیا بلکہ اُسے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جمہوری نظاموں میں کوئی اساسی تبدیلی تو کیا کوئی معمولی سے معمولی تبدیلی کا لانا بھی بڑا ہی مشکل کام ہے۔

جمہوریت کے بعض پجاریوں کو کبھی کبھی یہ کہتے بھی سُنا گیا ہے کہ چلئے یہ ساری باتیں کسی حد تک درست ہی سہی مگر اس نظام میں اتنی گنجایش تو موجود ہے کہ مظلوم جب چاہیں مملکت کی "آزاد عدالتوں" کی طرف رجُوع کرکے انصاف حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی مدد سے ظالموں کو سزا دی جاتی ہے اور مستحقین کو ان کے حقوق لوٹائے جاتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ نظام سرمایہ داری میں عدالتوں سے اس قسم کی توقعات وابستہ کرتے ہیں کیا وہ فریب نفس میں مبتلا ہیں یا فریب نظر کا شکار ہیں؟ لیکن اتنی بات ہر معمولی سے معمولی انسان بھی جانتا ہے کہ جب "مناصب" کے چاہنے والے "یہ عہدے" ایک مخصوص طبقے کے "فیضانِ کرم" سے حاصل کرتے ہوں تو پھر عدالت کی کرسیوں پر براجمان ہونے کے بعد وہ اپنے "آقا و ولی نعمت" کو کس طرح بھول سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ انہیں اس بات کا پوری طرح علم ہو کہ اُن کا ان عہدوں پر قائم رہنا اور ترقی کرنا انہی کی "ذات گرامی" سے وابستہ ہے۔ اگر بالفرض سَو میں سے بلکہ ہزار میں سے ایک آدھ "سر پھرا" اپنے ضمیر اور ایمان کے

[1] "تخریب پسندی اور وطن دشمنی" "و ترقی پسندانہ" اصطلاحیں ہیں جو تہذیب الحاد کے کارخانہ تکفیر سے ابھی ابھی ڈھل کر آئی ہیں۔ ان کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اقتدار کے ہر مخالف پر انہیں آسانی سے چپکایا جاسکتا ہے۔ تہذیب جدید کے "مشائخ" نہ صرف ان کو موقع اور محل کے مطابق اچھی طرح استعمال کرتے ہیں بلکہ ان سے پورا پورا فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقاضوں سے مجبور ہو کر حکمران طبقے کے خلاف کوئی فیصلہ دینے کی جسارت بھی کرتا ہے تو قانون کے بندھن اُس کا ہاتھ روک لیتے ہیں۔ ملک کا مروجہ قانون اس بنیاد پر مدون کیا جاتا ہے کہ ملک کے اہل ثروت ہر لحاظ سے محفوظ رہیں۔ ہیرلڈ لاسکی اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ملک کا دستور ابدی اور غیر متغیر قوانین پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ یہ نام ہے چند ایسے ضوابط کا جن کو وقتاً فوقتاً وقتی مصالح کے پیش نظر بدل دیا جائے۔ قانون کا تانا بانا تیار کرنے وقت چند ہی مقاصد سامنے ہوتے ہیں[1]۔ ججوں کے ہاتھ میں یہ اختیارات نہیں ہوتے کہ وہ خود قوانین وضع کریں اور پھر ان کے مطابق فیصلے دیں۔ اُن کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ رائج الوقت قانون کو حالات پر منطبق کر کے فیصلہ صادر کریں۔ جج بیچارے ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھتے ہیں مگر اُف تک نہیں کر سکتے۔ اُن کے قلم ہر صبح اور ہر شام اُن کی بے بسی اور مجبوری کی چغلی کھاتے ہیں۔ وہ با اختیار ہونے کے باوجود بے اختیار ہوتے ہیں[2]"

اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جج بالعموم ملک کے با اثر طبقے سے لیے جاتے ہیں۔ ایک خاص ماحول میں اُن کی پرورش ہوتی ہے، اس وجہ سے اُن کی ذہنی ساخت کچھ اس قسم کی ہو جاتی ہے کہ فیصلے دیتے وقت وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ہی طبقے کے لوگوں کا پاس رکھتے ہیں۔ "قرطاس" پر لکھا ہوا قانون بیشک امیر اور غریب کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا مگر عمل کے اعتبار سے ان دونوں میں عظیم فرق ہے۔ اگر کسی کو اس کا اندازہ کرنا مقصود ہو تو وہ عدالتوں میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ایک قسم کے مجرموں میں محض دنیاوی مراتب کے تفاوت کی وجہ سے قانون کے اندر کتنی لچک پیدا ہو جاتی ہے۔

---

[1] H. Laski : The Crisis of Democracy p. 129

[2] پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر منیر نے گجرات کے ایک قتل کے مقدمے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ججوں کے فیصلوں پر صرف اُن کے ذاتی میلانات ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات دولت کا لالچ اُن کو "راہِ حق" سے پھیر دیتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں دنیاوی جاہ و جلال اور مادّی فوائد و لذائذ زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے ہوں وہاں ہر فرد کے دل میں اُن کے حاصل کرنے کی خواہش کا موجزن ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ جج اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے وہ محض حقیر فائدوں کے لیے کئی بے گناہ لوگوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ وُسکونٹ برائس (Viscount Bryce) اپنی شہرۂ آفاق کتاب جدید جمہوریتیں (Modern Democracies) میں لکھتا ہے:۔

"بد اخلاقی کے سارے مظاہر میں سے عدلیہ کی بد دیانتی سب سے زیادہ نفرت انگیز ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے آسان طریقہ ہے جس کی مدد سے امیر غریب کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ فرانسیسیوں کو اپنی عدالتوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ امریکہ میں بعض ججوں پر ایسے جج موجود ہیں جن کے انتخاب میں یا تو سیاستدانوں کا دخل ہے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں کا۔ بعض شہروں میں وکلاء بھی عدالتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ججوں کی رائے کے بدلنے کے طریقوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اب رشوت ستانی کے ایسے عمدہ طریقے نکل آئے ہیں جن پر کسی کو کوئی شک نہیں ہوتا۔ لوگ اب ججوں کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر نہیں لگاتے، بلکہ اُن کو صرف اتنی اطلاع دینا کافی ہے کہ اگر وہ بعض مقدمات کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیں تو فلاں فلاں کمپنی میں انہیں بغیر سرمایہ لگائے اتنے حصوں کا مالک بنا دیا جائے گا۔"[۱]

عدلیہ کا انتظامیہ سے آزاد ہونا بھی صرف ایک ڈھونگ ہے۔ اس دور میں جب کہ حکومتیں اپنی انتظامی مشینری کو بڑی سُرعت کے ساتھ مرکزیت (Centralization) کی طرف لے جا رہی ہوں کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی ملک میں عدلیہ کا شعبہ یکسر آزاد ہوگا۔ ججوں کا انتخاب

۱ے Viscount Bryce : Modern Democracies pp. 526-27

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام کے نمایندوں کی ایک مجلس کے سپرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان کی آراء پر ہر وقت اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بے ضمیر مفاد پرست سیاسیئین کا یہ ٹولہ جب کسی جج کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا تو رائے عام کو فوراً اس کے خلاف اُبھار دیتا ہے، اس طرح جج بیچارہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے کہ یا تو اُن کی بات مان لے یا عدالت کی کرسی خالی کر دے۔ لہٰذا وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ "بڑی سرکار" سے جو "اطلاع" پائے اُسی کے مطابق بلا چون و چرا فیصلہ دے ڈالے۔ پبلک کے نمایندوں کی بے جا دخل اندازی نے جس طرح انگلستان کی انتظامی مشینری کو برباد کیا ہے اُس کا رونا روتے ہوئے جی۔ ایلس۔ بارکر (J. Ellis Barker) کہتا ہے:۔

"انگلستان اب ایک وسیع کاروبار ہے جس کو چند ناآموزدہ (   ) اور جھگڑالو منتظمین اپنی اپنی خواہشات کے مطابق چلا رہے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا انسان نہیں رہا جو ان بے علم اور ناتجربہ کار لوگوں کی راہنمائی کر سکے۔ ان لوگوں کو کام سے کوئی غرض نہیں، بلکہ ان کی ساری دلچسپیاں صرف اسی ایک بات پر مرکوز ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان عہدوں پر قابض رہیں۔"[2]

---

[1] پچھلے دنوں امریکہ میں روزن برگ (Rosenberg) اور اُس کی زوجۂ حیات کو عدالت نے جس دباؤ کے تحت موت کا حکم سنایا وہ عدلیہ کی آزادی کے پردے کو چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان بیچاروں کو محض حکمران طبقہ کے ایما پر ختم کیا گیا۔ جیوری کے ایک ممتاز رکن لارڈ جیوٹ (Lord Jowitt) نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ اس سزا کے لیے شہادتیں ناکافی ہیں۔ مگر چونکہ حکمران طبقہ ان کے خون سے ہاتھ رنگنے پر تلا بیٹھا تھا اس لیے کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی حتیٰ کہ جب جسٹس ڈگلس (Douglas) نے دلائل کے کمزور ہونے کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ چلانے کی اجازت دینا چاہی تو جمہوریت کے پرستاروں نے سخت واویلا کیا اور جج کو مواخذہ (impeachment) کی دھمکی بھی دی۔ مرنے والے مر گئے مگر ان کی موت سے جمہوریت کے سارے بلند بانگ دعووں کی اصلیت دنیا پر آشکارا ہو گئی ہے۔

[2] Hearnshaw : Democracy on Cross ways p. 64

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر انصاف کوئی ایسی "ارزاں شئے" نہیں جس کو خریدنے کی ہر کس وناکس میں طاقت ہو۔ اقتدار کی اس "منڈی" (Power market) میں سب سے قیمتی چیز یہی عدل ہے۔ اس لیے اسے صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کی جیبیں ڈالروں سے پُر ہوں۔ اس کے ساتھ ہی "انصاف کے طلبگار" کو اتنی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ غریب اور نادار لوگ سخت سے سخت مظالم کو برداشت کر لیتے ہیں، انہیں سخت سے سخت بے انصافی گوارا ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

یہ ہے جمہوریت کی اصلیت۔ حقائق اگرچہ بڑے ہی تلخ ہیں مگر وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں محض "پراپیگنڈہ" کا لفظ استعمال کر کے انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جہاں جہاں لوگ اس نظام کے اندر زندگی گزار رہے ہیں وہ اس کی تلخیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہر ملک میں حالات ایک جیسے نہ ہوں مگر فرق جو کچھ ہے وہ مدارج کا ہے نوعیت کا نہیں۔ اس بُت کے پرستار بعض واقعات کی تردید کر سکتے ہیں مگر وہ اس ظالمانہ ماحول کا انکار نہیں کر سکتے جس کو ان واقعات نے مل کر پیدا کیا ہے۔ کسی ایک واقعہ کی توجیہہ کی جا سکتی ہے مگر اس ظلم کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے جس سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسان آشنا ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آج بھی پندار اور غرور نے الوہیت و خدائی کی اسی صورت کو اختیار کر رکھا ہے جو نمرود کا خاصہ تھا۔ آج بھی قوم، وطن اور "مفادِ عامہ" کے نام پر انسانی خواہشات و آرزوؤں کے صنم خانے آباد ہیں۔ نام کے تبدیل کر دینے سے دکھ دُور نہیں ہوتے۔ اس کے لیے انسان کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے[1]۔ (باقی آئندہ)

[1] اگر کوئی صاحب جمہوریت کے سیاسی پہلو کا مزید مطالعہ کرنا چاہیں تو وہ مندرجۂ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۱) اسلام کا نظریہ سیاسی از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
(۲) M. B. Mitin : Soviet Democracy and Bourgeois Democracy
(۳) Burns · Democracy
(۴) Joseph A. Schumpeter : Capitalism, Socialism and Democracy
(۵) G. D. H. Cole : Essays in social theory
(۶) Viscount Bryce : Modern Democracies
(۷) Briefs : The Proletariat
(۸) Hearnshaw : Democracy at the Crossways
(۹) H. Laski : Democracy in Crisis

© rasailojaraid.com